راشد آذر
آب دیدہ

آبِ دیدہ

راشد آذر

Scanned with CamScanner

پہلی بار : ایک ہزار
اشاعت : نومبر ۱۹۷۴ء
قیمت : دس روپے

سرورق : قیصر سرمست
تزئین : شاذ تمکنت

بلاک میکنگ : گرو بلاکس، ایڈن باغ روڈ۔ رامکوٹ۔ حیدرآباد ۱
بلاک پرنٹنگ : 'وِستاز'
لیتھو طباعت : ایکسل فائن آرٹ لیتھو اینڈ آفسٹ ورکس۔ محبوب چوک۔ حیدرآباد
جلد سازی : محمدیہ بک بائینڈنگ ورکس، رُوبرو عبادت خانۂ حسینی۔ چھتہ بازار۔ حیدرآباد ۲

ناشر :
ادارۂ شعر و حکمت، بازار نورالامرا۔ حیدرآباد ۲۴

خوشنویسی
سلام خوشنویس

ترتیب

فاطمہ

کے نام

جو میری بیوی بھی تھی اور محبوبہ بھی

ساتھ تھا تیرا تو ہمت تھی کہ روشن ہے جہاں
تو نہیں ہے تو اُجالے سے ڈھل جاتا ہوں

راشد آذر

داستانِ بے ستون و کوہکن

شکستہ بُت ہیں جبیں زخم زخم بت گر کی
سرہانے تیشہ کے لرزیدہ ہے کوئی جھنکار
——— شاذ

راج بھون روڈ پر ایک خوبصورت گھر 'تمنّا' ہے۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی خاکی وردی میں ملبوس ایک چوکیدار ملے گا جو فوجی انداز کے سلام کے بعد اس طرح قدم لے گا کہ آپ میں خود اعتمادی کا احساس جاگ اُٹھے گا۔ آپ جُوں ہی گھر کے اندرونی حصّے میں قدم رکھیں گے آپ کو شدید احساس ہوگا کہ آپ نفاست و لطافت کے ماحول میں آ گئے ہیں۔ ہر چیز قرینہ سے سجی ہوئی ملے گی۔ سامنے ایک خوبصورت خاتون کی تصویر پر نظر پڑے گی جس کی آنکھوں کا سکوت پورے گھر پر چھایا ہوا محسوس ہوگا۔ اس تصویر سے نکلتی ہوئی محسوس و نامحسوس شعاعوں نے در و بام پر سنّاٹے بُن دیئے ہیں۔ آپ سنّاٹے میں ملفوف اور آگے بڑھیں گے تو خم کھاتا ہُوا زینہ ملے گا اور سیڑھیوں ہی پر سُرخ قالین قرینہ سے دَھرا ہوگا۔ زینہ طے کرنے پر بائیں ہاتھ کی طرف

ایک کُتب خانہ نظر آئے گا جس میں اُردو اور انگریزی کی بے شمار کتب ہیں شیشہ کی الماریوں میں لگی ہوئی ملیں گی۔ اسی سے ملحق ایک منی بار ہوگا جس میں دُنیا بھر کی بہترین شرابیں دھری ہوں گی۔ یہاں آپ کی ملاقات ایک میانہ قد کے انسان سے ہوگی جس کا رنگ گورا، آنکھوں پر عینک، فراخ ماتھا (جو غائب ہوتے ہوئے بالوں کی وجہ سے اور بھی فراخ لگتا ہے) داہنے گال پر ناک کے قریب ایک ننھا سا مسّہ، باریک ترشی ہوئی مونچھیں، سفید براق کرتے اور پاجامہ میں ملبوس راشد آذر نظر آئے گا۔

راشد آذر سے میری ملاقات کب، کہاں اور کیسے ہوئی تھی مجھے یاد نہیں لیکن یہ حکایتِ دلداری کوئی بیس بائیس برس پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ کبھی راشد افسر تھا اور اب راشد آذر کے نام سے مشہور ہے۔ ہر دَور میں وہ ایک بُردبار، سنجیدہ مخلص اور غور و فکر کرنے والا شاعر رہا ہے۔ میں نے فن کار کی حیثیت سے بھی اُسے حُد درجہ دیانت دار پایا ہے۔ وہ اپنے شعر کے ساتھ کچھ عابدِ شب زندہ دار کا سا تعلقِ خاطر رکھتا ہے۔ کوئی شعر سُن کے داد دے تو وہ مسرور ہے اور کوئی نہ سُنے بھی تو اس کو سُنانے کی خواہش نہیں رہتی۔ وہ ہر حال میں ایک فقیرِ بے نیاز کی طرح اپنی گلیم میں مست نظر آتا ہے۔ یہ بے نیازی ایک فنکار کے لئے ضروری بھی ہے ورنہ اس کی انفرادیت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور وہ ہر تحریک کے ساتھ چل پڑتا ہے اور ہر رنگ پہ للچا اُٹھتا ہے، نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات۔

راشد آذر ایک نہایت ذی حیثیت اور متمول گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اس کی مثال اُن لوگوں جیسی ہے جو محلوں میں پلے بڑھے اور جھونپڑوں کے خواب دیکھتے رہے۔ راشد آذر مارکسی نظریۂ حیات کا دل و جان سے قائل ہے۔ اُس نے اپنے سن و سال کی ناپختگی کے زمانے میں گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور چاہتا تھا کہ مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرے۔ چند مخلص پارٹی کے

رہنماؤں نے اسے اس حماقت سے دُور رہنے کا مشورہ دیا ورنہ ایک شاعر شاید لیڈر بن کر رہ جاتا جو یقیناً ایک ادبی المیہ ہوتا۔ اُن دنوں اچھے خاصے پڑھے لکھے نقادوں کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ انقلاب کی جنگ میں ہر ایک کا حصّہ بقدرِ صلاحیت ہونا چاہیئے۔ ایک شاعر اور ادیب کا ہتھیار اُس کا قلم ہوتا ہے، یہ نکتہ بیس برس پہلے کے نقّادوں کے ذہن سے دُور تھا۔ وہ ہر ایک کو بندوق کی نالی سے ناپ کر فیصلے صادر کیا کرتے تھے۔ شکر ہے ادب کا وہ دَور ایک گزرتے بادل کی طرح ختم ہو گیا ورنہ نہ جانے کتنی نظمیں نا آفریدہ رہ جاتیں اور کتنے شعر نعرۂ محض بن کر رہ جاتے۔

راشد آذر زندگی کے ہر موڑ پہ ایک خود رائے، خود آگاہ اور خود مختار شخصیت کا مالک رہا ہے، وہ جس چیز کو صحیح مانتا ہے چاہے اُس کی مخالفت ایک دُنیا کرے وہ گھاٹ کے پتّھر کی طرح اٹل رہے گا۔ شادی سے لے کر ملازمت تک اس کا سر پھر اپنی کلاہِ کج کی طرح بانکپن کا مظہر رہا ہے۔ وہ اپنے میدان کا آپ حریف ہے، اپنی کشتی کا آپ ناخدا ہے، آپ بادبان ہے۔ اُس نے شکست کے موقع پر بھی صُلح نہیں کی ہے۔ غرقابی کے وقت بھی مدد کے لئے نہیں پکارا۔ اتنے خوش حال گھرانے کا فرد ہوتے ہوئے بھی جہاں دولت اور عزت کی کمی نہیں، اُس نے فکرِ معیشت اور غمِ روزگار کی تلخیاں بھی چکھی ہیں۔ وہ دفتر جہاں اُس کی والدہ وزارت کا قلمدان سنبھالے ہوئے تھیں، اُس نے وہیں نوّے روپے کی کلرکی بھی کی ہے اور اپنی ماں سے بھی کسی اچھی سی نوکری کا طلب گار نہیں رہا ہے اور نہ ہی اپنے گورنر ماموں سے اپنے لئے کوئی سعی و سفارش چاہی۔ وہ کلرک رہا، وکالت کی، پھر ٹیچر بن گیا اور ہر دَور میں اُس کے مزاج کی ٹیڑھ برقرار رہی اور آج بھی جس ملازمت سے وابستہ ہے وہ دو دھاری تلوار سے کھیلنے کے مترادف ہے — پُل صراط کے سفر کا یہ راہی ہر روز ثابت قدم گزر جاتا ہے اور اُس کے حکّامِ بالا اس کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی ایک مہذب آدمی آپ اپنی کرتا ہے۔ مجھے اس کے مزاج کی نوک سے ہمیشہ ڈر رہتا ہے کہ کل وہ کیا رُوپ اختیار کرے اور کون سا پیشہ اپنا لے۔

بی۔ اے کے بعد جب وہ بیروزگار تھا، ایک دن اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم بھی بیکار گریجویٹ ہو اور میں بھی، کیوں نہ ہم مل کر پان کی دُکان کھول لیں اور سائن بورڈ پر ناموں کے ساتھ ڈگریاں بھی آویزاں کر دیں۔ یہ بات اُس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہی تھی لیکن ہم دونوں اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ اس لئے کہ ہمیں کہیں نہ کہیں کام مل گیا تھا اور ہم روٹی کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

راشد آذر غضب کا پابندِ اوقات شاعر ہے۔ مَیں نے اپنے احباب میں مخدوم کے سوا شاید ہی کسی دوست کو اس قدر پابندِ معمولات دیکھا ہے، جتنا راشد آذر ہے اگر وہ چھ بجے گھر آنے والا ہو تو میں چھ کے گھنٹوں کے ساتھ ہی اُس کی کار کے ہارن کی آواز سُنتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ راشد کار سے اُترتے ہوئے مجھے 'وش' کر رہا ہے۔ وہ مشاعروں اور محفلوں میں میرے منع کرنے کے باوجود وقت پر پہنچ جاتا ہے اکثر مشاعروں میں یُوں بھی ہوا ہے کہ ابھی مائیکروفون نصب کیا جا رہا ہے شطرنجیاں بچھ رہی ہیں، چاندنیاں اور گاؤ تکیے منگوائے جا رہے ہیں اور راشد آذر مقررہ وقت پر موجود ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر اکثر پانچ دس منٹ کے انتظار کے بعد واپس ہو جاتا ہے اور اکثر مشاعرے اور محفلیں اُس کے کلام کے بغیر ہی سُونی رہ جاتی ہیں۔ گویا وقت پر جانا اور منتظمین کی حالت پر ترس کھا کر لوٹ آنا راشد آذر کا معمول ہے۔

با ایں پابندی وہ مزاجاً آوارہ ہے، لیکن اُس نے اپنی شاعرانہ آوارگی کو لگام دے رکھی ہے۔ وہ ہر شام پیتا ہے مگر مقدار اور وقت کی پابندی کے ساتھ۔ مَیں نے اُسے بہکتے دیکھا نہ کبھی اُس کی زبان میں لکنت محسوس کی ہے۔ اُس نے مے نوشی کو ایک تہذیب بنا دیا ہے۔ پینے کے آداب اور سلیقہ دونوں شاید اس شاعر پر ختم ہیں۔ راشد کی بادہ پیمائی کی نفاست و نزاکت، ضبط و احتیاط مولوی بھی دیکھ لے تو قائل ہو جائے مُفتی کی نظر پڑے تو شاید دینی فتوے کے بارے میں لمحہ بھر کو سوچے۔ وہ گھونٹ نہیں لے گا بلکہ چکھے گا، فوری نگلے گا نہیں بلکہ تالو اور زبان کی نوک پر تولے گا، پھر گھولے گا اس طرح آہستہ آہستہ کاروانِ کیف و مستی کو آگے بڑھائے گا یہاں تک کہ سُرور

کی نیم خواب وادیاں شروع ہوں گی اور وہ اس سوتے جاگتے منظر کو گھنا اندھیرا بننے نہیں دے گا بلکہ اس کیفیت ہی کو دیر پا بنائے رکھے گا۔

راشد آذر میں بے ساختگی و بے تکلّفی، ضبط و احتیاط کے ساتھ کچھ اس طرح گھُل مِل گئی ہیں کہ خود بخود اُس کے اطراف آدابِ دوستانہ کا ہالہ سا کھنچ گیا ہے۔ اُس نے جیسے ایک حد کھینچ رکھی ہے، جہاں وہ سلوکِ ظاہر و باطن سے معیارِ محبّت و وابستگی قائم کرتا چلا جاتا ہے۔ راشد آذر سے مِل کر مجھے اکثر جگر کا یہ مصرع یاد آتا ہے ــــــ

کبھی بے ادب نہ گزرا مِرے پاس سے زمانہ

سپردگی اور سپر اندا ختگی اس کی فطرت نہیں، اظہارِ محبّت وہ برملا جانتا ہی نہیں، رِقّت و شدّت اس کا حصّہ نہیں، لیکن اس کے باوجود وہ جس کو چاہتا ہے، ٹُوٹ کر چاہتا ہے۔ یُوں بھی اس کا حلقۂ احباب بہت محدود ہے۔ خاص طور پر جسے صحیح معنوں میں دوست کہہ کر پکارا جا سکے، شاید دو چار نام ہی اُس کے لوحِ دل پر نظر آسکیں۔ وہ ہر اجنبی سے بھی کھُلے دل سے ملے گا، ہر ملاقاتی سے اخلاق سے پیش آئے گا لیکن اپنی ملاقاتوں میں اُن پر یہ ظاہر کیئے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ ع

ضبطِ سخن چاہیئے اہلِ نظر کے حضور

اس طرح وہ مجھے کبھی کبھی اکھل کھرا اور کھُردرا بھی نظر آتا ہے لیکن یہ کھُردراہٹ اُس وقت نظر آتی ہے جب بات اُصول کی ہو رہی ہو۔ وہ اصولوں کو جذبات پر قربان نہیں کر سکتا، چاہے اس میں کسی کی دل شکنی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ہر وقت دِل کے ساتھ پاسبانِ عقل کو رکھے گا لیکن کبھی کبھی تنہا چھوڑ دینے پر بھی راضی ہو جائے گا، جہاں اسکاچ وِھسکی اُس کے ذائقہ کا معیار ہے وہیں معمولی دیسی شراب بھی گھٹیا جگہ بیٹھ کر پی لینے میں اُسے عُذر نہ ہوگا لیکن یہ سب کچھ احباب کے اِصرار پر ہوگا مگر وہاں بھی سلیقہ و نفاست اُس کی نگہداری کرتے رہیں گے۔

"نقشِ آذر" اور "صدائے تیشہ" کے بعد "آب دیدہ" راشد آذر کا تیسرا مجموعۂ کلام

ہے جو منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ نقشِ آذر سے صدائے تیشہ تک اور خاص طور پر "صدائے تیشہ" سے "آب دیدہ" تک راشدؔ آذر نے جذبات و خیالات کا ایک ایسا سفر طے کیا ہے جہاں اُسے زخم زیادہ اور پھول کم ملے ہیں۔ نقشِ آذر کا شاعر کم و بیش رُومانی ہے۔ چڑھتی جوانی کی محبّت کا کیف اِن نظموں کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ اس مجموعہ میں شاعر کی پہلی محبوبہ کی یادوں کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں جسے ایک دوسرے نے ایک خاص مدّتِ دوستی کے بعد رَد کر دیا تھا۔ اس میں رنجش تھی نہ جھگڑا بلکہ دونوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ طبیعتوں کا اختلاف مستقبل کی زندگی کو خوشگوار نہیں بننے دے گا، چنانچہ شاعر اور محبُوبہ جُدا ہو گئے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب راشدؔ آذر بمبئی میں تھا۔ یہاں بعض احباب نے اس علحدگی کو طرح طرح سے رنگ دینے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ میں نے راشدؔ کو خط لکھا اور معاملہ کی اصلیت جاننی چاہی۔ راشدؔ آذر نے مجھے تفصیل کے ساتھ بات سمجھائی کہ آگے چل کر پشیمان ہونے سے بہتر ہے کہ آغازِ سفر کے وقت ہی اپنا اپنا جائزہ لے لیں۔ اس طرح مجھے اُس کی بات میں بڑی معقولیت اور دُور اندیشی نظر آئی۔

پھر ایک دن وہ آیا جب اُس کی شادی فاطمہ سے ہوئی۔ شاعر نے جیسے سب کچھ پالیا، اُس کے شعر پر بھی جیسے فاطمہؔ کی حکمرانی تھی۔ یہ میاں بیوی ہی نہ تھے بلکہ، عاشق و معشوق بھی، جاں نثار دوست بھی۔ ہر جگہ میں نے دونوں کو ساتھ ہی دیکھا تھا۔ فاطمہؔ ایک نہایت ملنسار، کم گو اور حسین خاتون تھیں، وہ راشدؔ آذر کے دوستوں کا دل سے احترام کرتی تھیں، غرض کہ وہ شاعر کے مزاج میں دخیل تھیں، پھر بھی راشدؔ آذر جیسے "اِنٹلکچوئل کم بوہیمئن" کو فتح کرنا آسان کام نہ تھا اور یہ کام فاطمہؔ ہی سے ممکن تھا۔ یہ متاہل زندگی قابلِ رشک تھی، چھوٹا سا کنبہ، میاں بیوی اور ایک ننھا حسینؔ۔ راشدؔ آذر پوری تنخواہ فاطمہؔ کے حوالے کر دیا کرتا تھا اور اُسے پچیس روپے جیب خرچ کے لئے ملتے تھے۔ [مَیں اس بات کا ذکر یُوں ہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس خوشگوار زندگی کا انجام اور بھی غم ناک لگتا ہے جب ان چاہنے والوں کی قُربت و یگانگت کا خیال آتا ہے جس کی مثال

مشکل ہی سے ملے گی] راشد آذر اُن پچیس رُوپوں میں مگن اور مسرور رہتا تھا۔ کتابیں خریدنا اُس کا بہترین مشغلہ رہا ہے۔ اُن روپوں میں کچھ ایسی برکت تھی کہ مہینہ کے ختم پر بھی راشد آذر کے پاس دس پندرہ روپے بچ جاتے تھے۔ راشد آذر اپنی شریکِ حیات کی چوری سے ان روپوں کو جمع کرتا رہا اور ایک دن جب سو روپے پُورے ہو گئے تو اُس نے اپنی محبوبہ (بیوی) کے لئے ایک تحفہ خرید لیا۔ فاطمہ نے تحفہ پاکر پُوچھ تاچھ شروع کر دی کہ روپیہ کہاں سے آیا وغیرہ وغیرہ۔ راشد آذر نے جب بات بتا دی تب سے اُس کے بچے ہوئے پیسے بھی فاطمہ لے لیتیں اور پچیس روپوں میں جتنی کمی رہ جاتی، اُس کی تکمیل کر کے وہ راشد آذر کو جیب خرچ دے دیا کرتیں۔ گھریلو زندگی کی یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ایک سرمایۂ عظیم تھیں جو ایک دن راشد آذر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھن گئیں اور وہ بھری دُنیا میں تنہا رہ گیا اور آج بھی تنہا ہے۔ اگر حُسین کی وابستگی نہ ہوتی تو وہ شائد کوہ و بیابان میں بھٹکتا پھرتا۔

فاطمہ کی وفات نے جیسے راشد آذر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اُس کی شاعری زخم زخم ہو کر تاثیر و کیفیات کا نمونہ بن گئی۔ اس حادثہ نے اُس کی صلاحیتوں پر ایسی جِلا دی کہ اُس کے شعر میں عجیب سی کسک آ گئی ہے، سینہ کی آگ ابھی مدّھم نہیں پڑی ہے اور نہ جانے کتنے فن پارے اس بھٹّی میں تپ کر کُندن بننے والے ہیں۔

"آبِ دیدہ" ایک لہو لہان دل کی توریت ہے جس میں محبّت زخمی ہرن کے بانکپن کی طرح نظر آتی ہے۔ 'صدائے تیشہ' کا آخری حصّہ "لوحِ محفوظ" دراصل "آبِ دیدہ" کا سببِ آغاز ہے۔ 'لوحِ محفوظ' فاطمہ مرحومہ کی یاد میں لکھی ہوئی چند نظمیں ہیں، جو "صدائے تیشہ" میں شامل ہیں۔ ان نظموں کا تفصیلی مطالعہ دراصل ایک المناک ذہنی سفر ہے جہاں قدم قدم پر آنسوؤں کی جھیلیں اور آہوں کا دُھواں دُھواں منظر نظر آتا ہے، فاطمہ مرحومہ بقول شاعر اُس کی بیوی بھی تھیں اور محبوبہ بھی۔ فاطمہ کی دائمی جُدائی نے راشد آذر کے اشعار پر وہ دھار چڑھا دی ہے جو اس سے پہلے اس کے شعر کو نصیب

نہ تھی۔ داخلی شاعری دراصل شاعر کے لب و لہجہ کی اصلی پہچان ہوتی ہے۔ غم کی تاثیر نشاط سے زیادہ ہے۔ غم، نشاط سے بڑھ کر شعر آفریں ہوتا ہے۔ آواز کا نکیلا پن، محویت، خود فراموشی، گلے کی رُندھاہٹ اور لہجہ کی تھرتھراہٹ وغیرہ داخلی شاعری کے عناصر ترکیبی ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ شاعر اپنے ذاتی غم کو کس طرح آفاقی اور کائناتی بناتا ہے۔ ' آب دیدہ ' کی بیشتر نظمیں محض ذاتی غم کا نمونہ ہیں، جہاں ایک شخص اپنی رفیقۂ حیات کی جُدائی پر پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہا ہے ؎

نظر کے تار کو اشکوں کی چلمن توڑ دیتی ہے
میں چُپکے سے چلا جاتا ہوں کمرے میں
اور اپنا مُنہ
چھُپا لیتا ہوں تکیے میں
تو تکیہ بھیگ جاتا ہے

یہ آنسو کس نے دیکھے ہیں
جو تنہائی میں بہتے ہیں

"یہ آنسو کس نے دیکھے ہیں"
ماخوذ از "صدائے تیشہ"

راشد آذر پر فاطمہ مرحومہ کی وفات کا اس قدر شدید اثر ہے کہ اس کی وہ نظمیں جن کا بنیادی خیال براہ راست اس غم کا مظہر نہیں ہے، ان میں بھی تشبیہات موت کے تصوّر کو جگا دیتی ہیں ؎

دوڑ کر فون کے آلے کو اُٹھا لیتا ہوں
کوئی آواز نہیں صرف وہی کھر کھر ہے
گورکن جیسے کسی قبر میں مٹّی کھینچے
وقت کی قبر میں تم دفن ہو خوشیوں کی طرح

(واہمہ)

"آب دیدہ" غم کی شاعری کا کرب ناک دیوان ہے۔ میں غم کو جوہری توانائی سے تشبیہہ دیتا ہوں، جس سے تعمیر و تخریب دونوں ممکن ہیں۔ غم کی قوت شاعر کو آپ ہلاک بھی کر سکتی ہے اور طاقتِ شفا بھی عطا کر سکتی ہے۔ غم قاتل بھی ہے اور مسیحا بھی، زہر بھی ہے اور امرت بھی۔ ان دونوں میں امتیاز کر کے ایک مثبت غم کا انتخاب فن کار کا فریضۂ اوّلین ہے ورنہ غم متعدی مرض کی طرح دوسرے کے دلوں کو افسردہ کرتا چلا جائے گا۔ انفرادی غم دراصل انفرادی بھی نہیں ہوتا۔ بنی نوعِ انسان کے تجربات و مشاہدات کم و بیش مختلف نہیں ہوتے۔ دُکھ سُکھ کے جذبات یکساں اثرات مرتب کرتے ہیں اور غم و خوشی کی قدریں متعین کرتے جاتے ہیں۔ با ایں ہمہ فن کار پر یہ لازم ہے کہ وہ غم کو تعمیمی شکل دے دے تاکہ لذتِ تقریر پر سب کو اپنے دلوں کی ترجمانی کا گمان گزرے۔ "آب دیدہ" کی بعض نظموں میں راشد آذر نے اپنے غم کو وسعت بخشی ہے اور غم کو ایک قوت کا درجہ دے دیا ہے گو کہ ایسی مثالیں اس مجموعہ میں کم ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس غم کی بے پناہ قوت کا دھارا اُن زمینوں کی طرف موڑ دے گا، جو بظاہر بنجر ہیں لیکن جن کے بطن میں گلاب دفن ہیں۔ غم کی وُسعت کے چند نمونے ملاحظہ ہوں، جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے جہاں ایک شخص کا غم ہمہ گیریت کا درجہ پاتا ہے ؎

اور بھی لوگ مری طرح لئے یاد کے زخم
زندگی کاٹ دیا کرتے ہیں
اور مرتے ہیں تو سب کہتے ہیں، بیچارا شریف آدمی تھا
کتنے بے معنی ہیں الفاظ، نہ جذبات نہ رنگ
اور جو لفظ ترے مُنہ سے نِکلتے تھے کبھی

"لفظوں کی زندگی"

ہماری بات ہی کچھ اور ہے کہ ہم دونوں
جئیے تو اس طرح مل کر کہ مُنفرد بھی رہے
یہ ٹھیک ہی تو کیا ہم نے صرف پیار کیا

وہ پیار آج بھی زندہ ہے زندگی کی طرح

"وفا"

کام اتنے ہیں کہ فرصت ہی نہیں کچھ سوچوں
دن گزرتا ہے کچھ اس طرح کہ اِس ہاتھ سے کام
کس طرح ہوتا ہے، اُس ہاتھ کو معلوم نہیں
وقت کچھ اس طرح کٹتا ہے کہ جیسے کوئی جیب
کسی میلے میں کسی بھیڑ میں کٹ جاتی ہے

اور یہ سوچ کے جانے کبھی پھر فرصتِ غم
آج کے بعد ملے یا نہ ملے، شام ڈھلے
جا کے تُربت پہ تری رو کے چلا آتا ہوں

"اِک فرصتِ غم"

زندگی کے گہرے تلخ تجربے کو راشد آذر نے اپنی نظم "میں سوچتا ہوں" میں جس طرح سمیٹا ہے، وہاں اُس کی لَے نے غم کی لَو کو بہت اُونچا کر دیا ہے ؎

جو میں نے جانا
وہ راز سینے میں دفن ہے اور یونہی رہے گا
جو سُن لیا ہے
وہ میرے لب پر نہ آ سکے گا
پھر ایسے جینے سے فائدہ کیا
مَروں تو شاید
سکوں سے کچھ لوگ سو سکیں گے

"میں سوچتا ہوں"

"آب دیدہ" کی تین اور نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں "سنّاٹا" "ہُوک" اور "زخم زخم زندگی"۔ ان نظموں کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر اب وُسعتِ غم کے محرکات کی سیاحت میں مشغول ہے اور کھُلی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ یہاں فرد کا غم افراد کا غم بن گیا ہے۔ ان نظموں سے بڑی اُمید بندھتی ہے کہ شاعر قطرہ میں دجلہ اور ذرّہ میں صحرا دیکھنے کے لئے آمادہ ہے۔ پہلی نظم کا اقتباس ملاحظہ ہو ؎

رات انگاروں پہ لوٹے ہے تو دن آوارہ ہے
زندگی خود شور سے گھبرا گئی ہے اس قدر
سانس سنّاٹے کی رُکتی ہے کہ آہٹ بھی نہیں
درد کی چوکھٹ پہ دُنیا سر جھکائے، غم سے چُور
بے سروساماں یتیموں کی طرح رُسوا ہے آج

"سنّاٹا"

پانچ مصرعوں کی نظم "ہُوک" دیکھئے:

ہُو کا عالم، ٹوٹتے لمحوں کا کربِ بے اَماں
کم سے کم اپنی اَنا کے واسطے ہم چیختے
اور سنّاٹوں کی قبروں سے نکلتے تاکہ لوگ
دیکھ لیں ہم کو تو جانیں آج بھی ہم زندہ ہیں
اور کچھ ایسے کہ اپنے آپ سے شرمندہ ہیں

"ہُوک"

نظم "زخم زخم زندگی" کے یہ مصرعے ملاحظہ ہوں:

ہم ایک ٹھیس کے لئے رُکے ہوئے ہیں جو کبھی
جمود ریزہ ریزہ کر کے زخم زخم زندگی
ہتھیلیوں کے طشت پر سجا کے ہم کو بھینٹ دے

ہم اُس صدا کے منتظر ہیں جو سکوت توڑ دے
جو ایک لمحہ کے لئے دِلوں سے خُوں نچوڑ دے

میری رائے میں اس مجموعہ کی بہترین نظم " زندگی" ہے جہاں شاعر کا لب و لہجہ نہایت متوازن اور معتدل ہے ۔ یُوں لگتا ہے جیسے شاعر رو رو کر کچھ دیر کو سستا رہا ہے اور اُس کے شعر کے چہرے پر تلخی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک سوندھے پن کی کیفیت ہے اور اس نظم کے بہاؤ میں پُر سکون ندی کی سی فضا ملتی ہے ۔ اس نظم کی امیجری نہایت معنی آفریں اور تہ دار ہے ؎

برابر آب یاری ہو رہی ہے سب درختوں کی
مگر کچھ پیڑ بالکل جل چکے ہیں
اور ان کی ساری سُوکھی ٹہنیوں سے
اُسی بوڑھی کے گھر کا چُولھا جلتا ہے
وہی گُل مُہر کا پودا
بڑے ہی چاؤ سے تم نے جسے بویا تھا
اب بھی ہے
اُسی کی چھاؤں میں ہم بیٹھتے ہیں
— — — — — — — —
— — — — — — — —
— — — — — — — —

تمہیں گھر سے گئے مُدت ہوئی ہے
جواں ہونے کو آیا اپنا بیٹا اتنے عرصے میں
ہمارے گھر اب اکثر ایک لڑکی
آتی جاتی ہے

نئے پیڑ اُگ رہے ہیں
تتلیاں سُوکھے ہوئے پیڑوں سے اُڑ اُڑ کر
گھنے تازہ درختوں
اُدھ کھلی کلیوں پہ رَس پینے کو جاتی ہیں

"زندگی"

وقتِ گزراں کو اس نظم میں جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ فن کاری کی اعلیٰ مثال ہے۔ نئی نسل برابر پُرانی نسل کی جگہ لیتی رہے گی۔ محبّت فنا نہیں ہو گی بلکہ وہ مختلف پیکروں میں رُوپ بدل بدل کر اپنا جادُو جگاتی رہے گی۔ "نئے پیڑ"۔ "سُوکھے ہوئے پیڑ"۔ "تتلیاں"۔ "اُدھ کھلی کلیوں کا رَس" کی علامتیں نظم کے کینوس کو بہت وسیع کر دیتی ہیں۔

راشد آذر "آب دیدہ" کے ذریعہ اپنی نظموں پر انفرادیت کا ٹھپّہ لگاتا جا رہا ہے ایک آدھ نظم مثلاً "توازن" پر احتراالایمان کے لب و لہجہ کی گرفت نظر آتی ہے مگر اپنے پیش رو اچھے شعرا سے متاثر ہونے کی روایت مضرت رساں نہیں ہوتی بلکہ چراغ سے اسی طرح چراغ جلتے ہیں۔

راشد آذر بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہے۔ اس نے غزلیں بھی کہی ہیں اور "آب دیدہ" میں غزلوں کی کیفیت یقیناً اس کی نظموں سے کمتر ہے۔ راشد آذر کی غزلوں میں وہی غم جھلکتا ہے جو اس کی زیرِ نظر نظموں میں رَواں دَواں ہے۔ لیکن نظموں میں یہ غم ذاتی تجربہ کی چُبھن لیئے ہوئے ہے مگر غزلوں میں یہی غم روایت کے آہنی پنجوں سے مکمل طور پر نہیں نکل سکا ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے شاعر بہ پاسِ روایت غزل کے مخصوص ڈِکشن سے اِنحراف نہیں کر سکا ہے، چنانچہ ذاتی تجربہ کی کسک بھی پورے طور پر جادُو نہیں جگا سکی ہے۔ شاعر کو خود اعتراف ہے کہ وہ غزل کا شاعر نہیں ہے۔ ذاتی

تجربہ پھر بھی اپنی چوٹ دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ خاص طور پر راشد آذر کی تازہ غزلیں لائق توجہ ہیں جن میں شاعر نو بہ نو امکانات کی طرف بڑی سلامت روی کے ساتھ قدم اُٹھا رہا ہے۔ ذیل کے شعر اس کے گواہ ہیں ؎

بُجھ گئیں ساری تمنّا کے چراغوں کی لَویں
کِس سے پُوچھوں مرے گھر کا کہاں دروازہ ہے

ابھی بُجھا نہیں آنکھوں کے دشت میں سورج
غزالِ شوق ابھی رَم رہا ہے آنکھوں میں

اگر دریچہ نہ وَا ہو تو دَر سے ڈرتا ہوں
خبر نہیں پسِ دیوارِ آرزُو کیا ہے

پہلی سی اب بسیط اکائی کہاں سے لائیں
اِس دَور میں حیات بھی خانوں میں بَٹ گئی

مَیں ہُوں، سنّاٹا ہے، سُنسان مکاں، تنہائی
تُو نے اِس حال میں مجھ کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا

مَر مِٹ گیا تو کونسی دُنیا بدل گئی
زندہ رہا تو کب ہوئی تکمیلِ آرزُو

اُنھیں یہ ضِد کہ میں زخموں کا اشتہار بھی دُوں
مجھے تو شرم سی آتی ہے آہ بھرتے ہوئے

بس اِک یہی تو حقیقت کا رُخ اٹل نکلا
وہ وقت جا کے جو آتا نہیں وہ کل نکلا

کبھی نہ ختم ہوئی آرزوئے منزلِ شوق
ڈھلی جو دُھوپ تو سائے کے پیچھے چل نکلا

مَیں جس کو جاں سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں
دفینہ وقت کا کھودا تو ایک پل نکلا

تِرے بدن کی خُنک آنچ گر زیادہ لگے
ہَوا کا جھونکا بھی جیسے حریفِ بادہ لگے

تمام رات کٹی کروٹیں بدلتے ہوئے
ذرا سی نیند بھی بیمار کو زیادہ لگے

مَیں 'نقشِ آذر' اور 'صدائے تیشہ' کے شاعر سے زیادہ 'آب دیدہ' کے شاعر سے پُر اُمید ہوں جس کے ہاتھ میں اب ظلمات کے سفر کی جادہ پیمائی کے لئے قندیلِ غم روشن ہے جو آگہی اور بصیرت کے روغن سے نُور فشاں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ راشد آذر اس غم کی نم زمین سے نَو بہ نَو گُل ہائے رنگ رنگ کِھلاتا رہے گا جن میں نکہتوں کا تنوّع بھی ہوگا اور رنگوں کی فراوانی بھی۔

شاذ تمکنت

اے/۱۷۳ معظم پُورہ
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

گُفتی کہ چہ حالست فلان چشمِ پُر آبت

زآنخانہ چہ پُرسی کہ مہ و سال چکیدہ است

حافظؒ

بے دلی ہائے تماشہ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنّا کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں

غالبؔ

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم
ای بیخبر ز لذّتِ شُربِ مدامِ ما

حافظؔ

ڈھال لے موم ہوں، ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہوں
تیری آنکھوں کی شعاعوں سے پگھل جاتا ہوں

میری دُنیا میں ترے بعد نہیں ہے کوئی
آپ ہی آپ بہکتا ہوں، سنبھل جاتا ہوں

دوست بہلاتے ہیں تحفوں سے تو یہ سوچتے ہیں
ابھی بچّہ ہوں، کھلونوں سے بہل جاتا ہوں

ساتھ تھا تیرا تو ہمّت تھی کہ روشن ہے جہاں
تُو نہیں ہے تو اُجالے سے دَہل جاتا ہُوں

کیا غضب ہے تری جانب کبھی ڈرتے ڈرتے
آنکھ اُٹھاتا ہُوں تو ہر آنکھ میں کھل جاتا ہُوں

سُرخ آنکھیں کیئے یادوں میں کسی کی آذرؔ
مَیں بھی سُورج کی طرح شام کو ڈھل جاتا ہُوں

۱۲ر نومبر ۱۹۷۱ء

لفظوں کی زندگی

شام کٹتی نہیں، میں کاٹ دیا کرتا ہوں
چاند کی کرنوں میں تالاب کی موجیں گن کر
اور پھر رات گزر جاتی ہے
اور پھر دن بھی نکل آتا ہے
میں تری قبر سے ہوتا ہُوا دفتر کو چلا جاتا ہوں
فائلیں کھول کے الفاظ کا مُنہ تکتا ہوں
کتنے بے معنی ہیں الفاظ، نہ جذبات نہ رنگ

انہی الفاظ پہ ہے ساری تجارت کی اساس
اور جو لفظ ترے مُنہ سے نکلتے تھے کبھی
آج وہ دفن ہیں احساس کی پہنائی میں
اور مَیں سوچ رہا ہُوں کہ مری موت کو کتنے دن ہیں

○

اور بھی لوگ مری طرح لیئے یاد کے زخم
زندگی کاٹ دیا کرتے ہیں
اور مَرتے ہیں تو سب کہتے ہیں بیچارا شریف آدمی تھا
کتنے بے معنی ہیں الفاظ، نہ جذبات، نہ رنگ
اور جو لفظ ترے مُنہ سے نکلتے تھے کبھی!

۱۵ر دسمبر ۱۹۷۱ء

تیرے رُخسار پہ اشکوں کا مِرے غازہ ہے
میری آنکھوں میں وہ تصویر ابھی تازہ ہے

وہ جو اِک انجمنِ دل تھی، ترے ساتھ گئی
میری تنہائی مِرے پیار کا خمیازہ ہے

موت ہوگی جو تِرے پیار کا نشّہ ٹُوٹے
زندگی ہے جو ترے دَرد کا اندازہ ہے

یہ جو اِک شخص پھرا کرتا ہے سایہ کی طرح
یہ تری انجمنِ ناز کا شیرازہ ہے

بُجھ گئیں ساری تمنّا کے چراغوں کی لَویں!
کِس سے پُوچھوں مِرے گھر کا کہاں دروازہ ہے

ایک جُگ بیت گیا تجُھ سے بچھڑ کر لیکن
دلِ آذرؔ پہ ترا نقش ابھی تازہ ہے

۱۹؍جنوری ۷۲ ۱۹ء

تلاش

سپردِ خاک کیئے تم کو ایک سال ہُوا

عجیب بات ہے مَیں اِس طویل عرصے میں

تمہارے غم کو گلے سے لگائے دُنیا کے

ہر ایک کونے میں دِل کا سکون ڈھونڈ آیا

مگر، تمہارے بغیر اس زمیں کا ہر کونا
جلی ہوئی کسی بستی کی طرح اجڑا ہوا
تلاش کرتا ہے زیرِ زمیں مکینوں کو
ابھی تلک مری آنکھوں سے آگ بہتی ہے

۱۸ر جون ۷۲ ۱۹ء

قطعات

عجیب وقت ہے ہر چیز چھن گئی مجھ سے
مجھے تمہاری بھی یادوں پہ اختیار نہیں
میں سوچتا ہوں یہ منزل ہے کونسی کہ مجھے
تمہارے لوٹ کے آنے کا انتظار نہیں

ہم اپنے عشق کی خامی پہ روئے
سکونِ دل کی ناکامی پہ روئے
اگر روئے بھی ہم چھُپ کر جہاں سے
تمہارے غم کی بدنامی پہ روئے

تمام مطلعِ دُنیا پہ اِک اُداسی ہے
تمہارے بعد مری زندگی سزا سی ہے
اِسی زمینِ تمنّا میں بیج بوئے تھے
یہی زمین مرے آنسوؤں کی پیاسی ہے

وہی کمرہ، تمہارے ساتھ جس میں
گذارے تھے کئی لمحے خوشی سے
اُسی چھوٹے سے کمرے کو اکیلا
میں کب سے تک رہا ہوں خامشی سے

مآلِ عشق غم بھی ہے خوشی بھی
محبّت ظُلم بھی ہے بے بسی بھی
عجب اِک زخم ہو کر رہ گئی ہے
تمہاری یاد سے وابستگی بھی!

نہ جانے کس سے کیا کیا کہہ گیا ہُوں
وہ کہتے ہیں کہ رَو میں بہہ گیا ہُوں
حقیقت یہ ہے جب سے تم نہیں ہو
اُجالے میں اکیلا رہ گیا ہُوں

۱۶؍اگست ۱۹۷۲ء

اِحتیاط

تمہاری قبر پہ آیا ہُوں چھُپ کے دُنیا سے
مجھے یہ ڈر ہے کہیں کوئی مجھ کو ڈھُونڈ نہ لے
کہ راستے میں جو اشکوں کے جل رہے ہیں چراغ
یہ راز فاش نہ کر دیں کہ مَیں تمہارے پاس

ہجوم و شورشِ دُنیا سے بچ کے آیا ہُوں
بہت عزیز ہے مجھ کو یہ ایک تنہائی
مَیں ورنہ یوں تو ہر اِک شام بزمِ یاراں میں
گذار دیتا ہُوں تنہائیوں سے گھبرا کر
تمہارے ساتھ مگر شام جب گُزرتی ہے
مَیں چاہتا ہُوں کسی کو مِرا پتہ نہ چلے
اِسی لئے تو ہر اِک نقشِ پا مِٹا آیا
جہاں جہاں مِرے آنسو گرے اُٹھا لایا

۲۸ر اگست ۱۹۷۲ء

یادوں کا مقبرہ

مری جوانی مجھے اب بھی یاد کرتی ہے
وہ رنگ ڈھنگ، وہ سج دھج، وہ بانکپن، وہ وقار
وہ سحر تھا کہ کبھی دن کو رات کہہ دیتا
تو لوگ چاند ستارے بھی دیکھ لیتے تھے
نظر اُٹھاتا تو جھکتی تھیں خود بخود نظریں
وہ ولولہ، وہ تب و تاب، وہ تمازت تھی
مجھے چراغ جلاتا تھا اپنی آنکھوں سے

اور آج اپنے ہی چہرے سے خوف کھاتا ہوں
پڑے نظر جو کبھی آئینے پہ بھولے سے
تو ڈر کے اپنی نظر سے نظر چراتا ہوں
دمکتا چاند، چمکتے ستارے شاھد ہیں
تمہارے ساتھ جوانی بھی دفن کی میں نے
اور آج اپنی ہی یادوں کا مقبرہ ہوں میں

۵ نومبر ۱۹۷۲ء

یہ دو آنکھیں

حقیقت لوگ کیا جانیں
کہ میں تیرے جُنوں میں آج تک
مجنوں بنا کیوں پھر رہا ہُوں

مَیں اپنے رات، دِن، اور دوپہر کو

Scanned with CamScanner

شکم، دل، ذہن میں تقسیم بھی کرنے نہ پایا

یہ دو آنکھیں لیئے دِن رات پھرتا ہوں

یہ دو آنکھیں جو اب تک تیری آنکھوں کے فسانوں میں

الف لیلہ کے افسانوں کا افسوں یاد کرتی ہیں

اِن آنکھوں کو

ترِی زُلفوں کے بادل اور بدن کا لوچ

وہ اَبرُو، وہ چہرہ

یاد ہے اب تک

○

یہ آنکھیں کاش اندھی ہو گئی ہوتیں تو اچھا تھا

اب اِن آنکھوں سے کیا دیکھوں !؟

۱۸ر نومبر ۷۲ء۱۹

مَیں سوچتا ہُوں

مَیں سوچتا ہوں
جو مَیں نے چاہا
مجھے تو وہ مِل نہیں سکا ہے
جو مَیں نے سوچا
وہ آج تک مَیں نہ کر سکا ہُوں
جو مَیں نے پایا
وہ اِک خوشی تھی جو چِھن چکی ہے

جو مَیں نے دیکھا
وہ میری آنکھیں نہیں کہیں گی
جو مَیں نے جانا
وہ راز سینے میں دفن ہے اور یونہی رہے گا
جو سُن لیا ہے
وہ میرے لَب پر نہ آسکے گا
پھر ایسے جینے سے فائدہ کیا
مروں تو شاید
سُکوں سے کچھ لوگ سو سکیں گے!

۱۵ر جنوری ۷۳ء

بارِ خاطر

تمہیں کیسے بتاؤں میں
تمہارے پاؤں کی آہٹ سے دِل پر
کیا گزرتی ہے

○

مرے خوابوں کے کمرے میں
دبے پاؤں چلی آؤ

مجھے اب مت جگانا، میں

اُسی بستر پہ جس پر کل

تمہارے ناز اُٹھاتا تھا

بہت رو رو کے سویا ہُوں

○

مجھے نیندوں کے سنّاٹے میں خود

اپنی ہی آوازِ نفس بھی

بارِ خاطر ہے

۲۹ جنوری ۱۹۷۳ء

اَندوختہ

مَیں اپنے آنسُو کِسے دِکھاؤں ؟

○

ہے کون ایسا

ہو میرے اشکوں کے بحر سے

میرے دَرد کی وہ صَدف نکالے

جو رات بھر قطرہ قطرہ میرے لُہو کو پی کر

تمہاری یادوں کا ایک موتی بنا سکی ہے

جو مَیں نے سب کچھ لُٹا کے پایا

جو میرا اندوختہ ہے، میرا

فشردۂ جاں ہے

لختِ دِل ہے

○

مَیں اپنے آنسو کِسے دِکھاؤں؟

۱۱؍ فروری ۱۹۷۳ء

سَکرات

تمہارے بعد میرا حال کیا ہے کیا کہوں آخر
اگر یہ ہو سکے تم سے
کہ تم اِک بار پھر جی لو
تو دیکھو گی
تمہارا نام لیتا ہُوں تو میری
سانس رُکتی ہے

نوالہ حلق میں پھنستا ہے، آنکھیں

ڈبڈباتی ہیں

دہل جاتا ہے دِل جب مَیں

تمہارا ذکر کرتا ہوں

تمہارے ہجر میں یہ حال ہے اب تو

نہ ہنس کر خوش، نہ رو کر مطمئن ہوں مَیں

عجب سکرات کے عالم میں جیتا ہوں

۳ مارچ ۱۹۷۳ء

تمنّا

کیوں کوئی میرے لئے اشک بہائے آخر

ہے تمنّا کہ مروں بھی تو کسی ایسی جگہ

جہاں بھولے سے بھی جائے نہ کوئی

دُور اُفتادہ کسی اُجڑے ہوئے

گاؤں کا سُوکھا سا کُنواں ہو جیسے

یا کسی ٹوٹے ہوئے قلعہ کا تہہ خانہ ہو

بکرم خوردہ ہو مرا چہرہ

کہ دیکھے بھی تو پہچان نہ پائے کوئی

اور بے چہرہ مری لاش کو

دے دے کوئی گمنام سا نام

اور مشہور کرے

لاش کے کچھ

اچھے بُرے افسانے

نہ ہنسے اور نہ کوئی اشک بہائے مجھ پر

لوگ دیکھیں بھی مری لاش تو

تاریخ کا

اِک باب سمجھ کر دیکھیں

۱۲ر جولائی ۱۹۷۳ء

بے چہرہ کئی چہرے

جب نشّہ کے عالم میں
سویا تو خبر کیا تھی
ہر زخمِ دلِ خستہ
راتوں کے اندھیرے میں
آئینہ دِکھائے گا
چہرہ نہیں پرچھائیں
آئینے پہ اُبھرے گی

○

جب نشّہ کے عالم میں
سویا تو خبر کیا تھی
بے چہرہ کئی چہرے
ایسے نظر آئیں گے
مَیں نے جنھیں خوابوں میں
دیکھا ہے کبھی پہلے
جانا ہے جنھیں برسوں

○

جب نشّہ کے عالم میں
سویا تو خبر کیا تھی
دُھندلائے ہوئے سائے
سب ایک ہی پیکر کی
پرچھائیاں بن بن کر

سو رُوپ دکھائیں گے
اور میں ترے پیکر کو
بوسوں سے سجا دُوں گا
اور آنکھ کھُلے گی تو
آنکھوں میں بساؤں گا

۱۶ر جولائی ۷۳ ۱۹ء

کہوں تو کیسے کہ کیوں نم رہا ہے آنکھوں میں
بس ایک شخص کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں

اِس احتیاط کا عالم رہا ہے آنکھوں میں
کہ مُدّتوں سے لہُو جَم رہا ہے آنکھوں میں

اگرچہ سامنے چہروں کا اِک سمندر ہے
مگر وہ چہرہ جو کم کم رہا ہے آنکھوں میں

اندھیرا کیا ہے، اُجالا ہے کیا، کِسے معلُوم
تمہارے بعد کہاں دَم رہا ہے آنکھوں میں

○

تمام عُمر خوشی سے گزار دی مَیں نے
تمام عُمر ترا غم رہا ہے آنکھوں میں

وہ رات کیسے بھلاؤں ترے وِداع کی رات
خیالِ کاکُلِ برہم رہا ہے آنکھوں میں

ابھی بجھا نہیں آنکھوں کے دشت میں سورج
غزالِ شوق ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں

تراش لوں اُسے آنکھیں بھی موند کر آذر
وہ ایک چہرہ جو پیہم رہا ہے آنکھوں میں

۳۰ر جولائی ۱۹۷۳ء

وفا

نہ تم نے مجھ سے وفا کی نہ مَیں نے کی تم سے
وفا تو پیشہ غلاموں کا تھا جو عُمر اپنی
گُذار دیتے تھے آقاؤں سے وفا کرتے
اور اُن کی مرضی پہ اپنی جبیں جُھکاتے تھے
کہ اُن کا حقِّ نمک اِس طرح ادا ہو جائے
وفا کا نام بَدل جائے بھی تو کیا ہو گا

وفا، وفا ہی رہے گی، وفا نہ بدلے گی

○

ہماری بات ہی کچھ اور ہے کہ ہم دونوں
جیئے تو اس طرح مل کر کہ منفرد بھی رہے
یہ ٹھیک ہی تو کیا ہم نے صرف پیار کیا
وہ پیار آج بھی زندہ ہے زندگی کی طرح

۱۱؍اگست ۷۳ء ۱۹

زندگی

وہی بوڑھی ابھی تک ہے

ابھی کچھ دیر پہلے چُن رہی تھی

سُوکھے پتّے گھر کے آنگن میں

مُسلسل اِس طرح ہر روز اپنا کام کرتی ہے

کہ جیسے بہتے پانی کا تسلسل، یا

سحر سے شام نے جس طرح رشتہ جوڑ رکھا ہے

برابر آبیاری ہو رہی ہے سب درختوں کی

مگر کچھ پیڑ بالکل جل چکے ہیں
اور ان کی ساری سوکھی ٹہنیوں سے
اُسی بوڑھی کے گھر کا چولھا جلتا ہے

○

وہی گُل مُہر کا پودا
بڑے ہی چاؤ سے تم نے جسے بویا تھا
اب بھی ہے
اُسی کی چھاؤں میں ہم بیٹھتے ہیں
کل اُس پر اِک پپیہا
بے بسی سے
پیہو پیہو کر رہا تھا
اکیلے میں کلیجہ شاید اُس کا پھٹ رہا تھا

○

تمہیں گھر سے گئے مُدّت ہوئی ہے

جواں ہونے کو آیا اپنا بیٹا اتنے عرصے میں

ہمارے گھر اب اکثر ایک لڑکی

آتی جاتی ہے

○

نئے پیڑ اُگ رہے ہیں

تتلیاں سُوکھے ہوئے پیڑوں سے اُڑ اُڑ کر

گھنے تازہ درختوں

ادھ کھِلی کلیوں پہ رَس پینے کو جاتی ہیں

○

مری کنپٹیوں پر اب

سیہ بالوں میں تھوڑی سی سفیدی

مُسکراتی ہے

۱۳ر اگست ۱۹۷۳ء

توازُن

مَیں روز پَو پھٹے اُٹھتا ہوں اپنے بستر سے
وہ سارے کام جو معمُول بن چُکے ہیں مِرا
کچھ اِس طرح سے مَیں انجام دیتا رہتا ہوں
کہ جیسے کوئی نمازی ہُوں یا پُجاری ہُوں
پیالی چائے کی، اخبار، اور اِک روٹی
اِنہی سے روز مِری بُھوک پیاس بُجھتی ہے
نِکل کے گھر سے سرِ شام گھر کو لَوٹنے تک
بس آنکھیں پھاڑے ہُوئے دیکھتا ہُوں کارِ جہاں

زرِ سیہ کے ذخیرے چھُپائے زیرِ گلیم
کچھ ایسے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں جن کے لئے
جھکائی جاتی ہے اکثر جبیں پئے تعظیم
تمام مُلک میں اِفلاس مُفت بِکتا ہے
ہر ایک شہر، ہر اِک گاؤں، ہر محلّے میں
کھُلی ہوئی ہیں دوکانیں، ہر ایک بیوپاری
کچھ اِس طرح کا محبِّ وطن ہے برسوں سے
کہ دونوں ہاتھوں سے اشیائے خوردنی کی بجائے
وطن کی مٹّی کو تھیلوں میں بھر کے بیچتا ہے
تمام قوم کی آنکھوں میں دُھول جھونکتا ہے
اناج، عشق، تبسّم، ادب، مذاہب، علم
کسی کی اِسم نویسی، کسی کی دستاویز
عوام، حُسن، غرض سب کی چور بازاری

تمام سودے بہ مقدارِ نقد ہوتے ہیں
تمام مُلک میں ہڑتالیں، شور، ہنگامہ
حِصارِ شیشہ میں ہیں بند ایسے دانشوَر
کہ جن کے نام ہمارے لئے تھے منبعِ نُور
اور آج جیتے ہیں معجوُن پر کتابوں کے

○

اِسی طرح کے ہزاروں مناظر ایسے ہیں
جو آگ سینے میں میرے لگا بھی سکتے ہیں
مگر مَیں صرف اُنھیں آنکھیں پھاڑے تکتا ہوں
مجھے تو اتنی بھی فرصت نہیں کہ کچھ سوچوں
مشین ہے کہ مری زندگی ہے، چلتی ہے
مگر کبھی یہ توازن بگڑ بھی سکتا ہے

۱۴ راگست ۱۹۷۳ءٔ

○

وہ شخص تھک کے جو دشتِ جُنوں میں بیٹھا ہے
وہ شخص مَیں نہیں، وہ شخص میرا سایا ہے

مِرے بَدن کا لُہو، دِل کی آس لے کے گیا
وہ اِک ثمر جو مِری شاخِ دِل سے ٹوٹا ہے

اگر دریچہ نہ وا ہو، تو ڈر سے ڈرتا ہُوں
خبر نہیں پسِ دیوارِ آرزو کیا ہے

○

مَیں ڈھونڈ لیتا ہُوں اشکوں کی دُھند میں جس کو
وہ تم نہیں ہو تو پھر کیا وہ کوئی تم سا ہے

تمہاری آنکھوں کا جادُو ہے یا نمودِ سحر
اندھیرے میں بھی اُجالا دکھائی دیتا ہے

مجھے جو دیکھو تو آنکھوں سے پھُول برساؤ
ہُوں قصرِ شیشہ جو پتھر سے ٹوٹ جاتا ہے

اُس ایک جسم کو آذر تراشنے کے لئے
ہر اک بدن کو ہر اک زاویہ سے دیکھا ہے

۴ر ستمبر ۷۴ء

○

میرے پاس تم آئے بھی تو ایسے آئے خوابوں میں
تیر رہی ہیں میری آنکھیں اشکوں کے تالابوں میں

ابروؤں کے قوس کے نیچے آنکھوں کے نسخے مت پوچھ
جیسے بُت رکھے ہوں سجا کر مندر کی محرابوں میں

زخم، تجسس، بھوک، تمنّا، اشک، آوارہ گردی، غم
کتنے چکّر اور ہیں آخر لمحوں کے گرد ابوں میں

Scanned with CamScanner

کتنے چہرے ہم نے سجائے ہاتھوں کے گلدان سے پوچھ
آخر سب کچھ وقت بہالے جاتا ہے سیلابوں میں

تم کو خبر ہے صبحیں کتنی راتوں کو بخشیں ہم نے
نام ہمارا بھی لکھ لے اے شہر تیرے بے خوابوں میں

تنہائی، فرقت، مایوسی، حال کا ڈر، فردا کا خیال
جاتے ہوئے بانٹے ہیں تم نے یہ دُکھ ہم بنیا بوں میں

۸ر ستمبر ۱۹۷۳ء

قطعات

غمِ جُدائی تو تجھ کو بھی کھا رہا ہو گا
پھر اِس قدر نہ مجھے اپنے سے دُور رکھنا تھا
بدن تو ٹوٹ کے کہتا ہے احتیاط نہ کر
پلک جھپک کے یہ کہتی ہے بس قریب نہ آ

○

کتنا سکون خود کو بھلانے میں پایا ہے
لکھ لکھ کے اپنے نام کو میں نے مٹایا ہے
جب لوگ مجھ کو بزم میں پہچاننے لگے
میں نے خود اپنے آپ سے دامن بچایا ہے

۱۲ر ستمبر ۱۹۷۳ء

○

عارض سے ہو کے اُتری تو بازُو پہ چھُٹ گئی
دیکھیں کہاں تلک تری زُلفوں کی لَٹ گئی

ہونٹوں پہ پیاس لے کے ہرا دِن گُزر گیا
کروٹ بدل بدل کے مری رات کٹ گئی

یہ کیا، کہ تم نہ آؤ گے، مجھ کو یقین ہے
پھر بھی اِس انتظار میں دُنیا اُلٹ گئی

مَرنے کے دِن قریب ہیں یا دُور، کیا خبر
لیکن ترے بغیر مری عمر گھٹ گئی

دعوت بھی، احتیاط بھی، دُوری بھی، قُرب بھی
اِک کائنات ایک نگہ میں سمٹ گئی

پہلی سی اب بسیط اِکائی کہاں سے لائیں
اِس دَور میں حیات بھی خانوں میں بَٹ گئی

وہ راہ، جس پہ چل کے وہ آتے تھے میرے پاس
وہ راہ، آتے آتے کہیں سے پَلٹ گئی

چھُوٹی تھی جو وِداع کے وقت اُن کے پاؤں سے
وہ گرد میری پلکوں سے اکثر لپٹ گئی

آذرؔ مِٹا نہ ذہن سے پَل بھر کو اُس کا نقش
تصویر اس کی جیسے نظر سے چمٹ گئی

۲۳ ستمبر ۱۹۷۴ء

اِک فرصتِ غم

کام اِتنے ہیں کہ فرصت ہی نہیں کچھ سوچوں
دِن گزرتا ہے کچھ اِس طرح کہ اِس ہاتھ سے کام
کِس طرح ہوتا ہے اُس ہاتھ کو معلوم نہیں
وقت کچھ اس طرح کٹتا ہے کہ جیسے کوئی جیب
کسی میلے میں، کسی بھیڑ میں کٹ جاتی ہے

مجھ کو اِک لمحہ بھی دِن بھر کی صعُوبت سے اگر
بچ کے مِلتا ہے تو سینے سے لگا لاتا ہُوں

اور یہ سوچ کے، جانے کبھی پھر فرصتِ غم
آج کے بعد مِلے یا نہ مِلے، شام ڈھلے
جا کے تُربت پہ تری رو کے چلا آتا ہُوں

۲۱ر دسمبر ۱۹۷۳ء

تم اگر آج بھی آجاؤ

لوگ کہتے ہیں تو کہنے دو کہ مَیں ہنستا ہُوں
قہقہہ خوشیوں کا آواز میں ڈھل جاتا ہے
دِل میں غم ہو تو فقط چیخ نکل سکتی ہے
قبر پر پھُول کی چادر ہو تو کیا ہوتا ہے
خُون جمتا ہے تو کھِنچتی ہیں رگیں چہرے پر
کبھی تسکین، کبھی کرب اُبھر آتا ہے
تم نہیں ہو تو اُسی لاش کی مانند ہُوں میں

جس کے چہرے پہ سکوں ہے کہ کوئی منزلِ غم
موت کے بعد نہیں، مرحلے سب ختم ہوئے
یہ تبسّم نہیں، چہرے کی رگوں کا ہے تناؤ
مَیں وہی لاش ہوں تم نے جسے کفنایا تھا
تم اگر آج بھی آجاؤ تو زندہ ہو جاؤں
اور کفن پھاڑ کے دُنیا کو دکھادُوں اِک بار
قہقہہ کیا ہے، ہنسی کیا ہے، تبسّم کیا ہے

۳ر جنوری ۱۹۷۴ء

جو ہُوا مَیں نے اُسے خواب میں دیکھا بھی نہ تھا
تم مجھے چھوڑ کے جاؤ گے، یہ سوچا بھی نہ تھا

وقت نے آ کے مجھے خواب سے بیدار کیا
دو گھڑی کے لئے باہوں میں سمایا بھی نہ تھا

اِتنی بیزاری بھی کیسا ہے کہ نہ جاگے سو کر
پُورا افسانۂ غم مَیں نے سُنایا بھی نہ تھا

آنکھیں جلتی ہیں، بدن ٹوٹتا ہے، سر خم ہے
آپ کی یاد میں ایسا کبھی جاگا بھی نہ تھا

کیوں یکایک مجھے تُو آج لگے ہے معبُود
تیری دہلیز پہ سر مَیں نے جُھکایا بھی نہ تھا

تیری ہر بات کا افسانہ بنا لیتا ہُوں
اِتنا دیوانہ ہوں مَیں نے کبھی جانا بھی نہ تھا

تجھ کو لازم تھا مجھے اپنی جُدائی میں رُلائے
خُون آنکھوں سے بہے، اِتنا رُلانا بھی نہ تھا

تیری فرقت میں لہو روتی ہیں بے خواب آنکھیں
مَیں نے چاہا تھا، مگر اِتنا تو چاہا بھی نہ تھا

مَیں ہُوں، سنّاٹا ہے، سُنسان مکاں، تنہائی
تُو نے اِس حال میں مجھ کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا

پُوج اُس بُت کے ہر اِک خطِّ بدن کو آذر
اِس عقیدت سے مگر تُو نے تراشا بھی نہ تھا

۵ر فروری ۱۹۷۴ء

اگر یہ پیار نہ ہوتا

دوکانیں اتنی سجی ہیں کہ ہر دوکان پہ ہم
نہ رُکتے ہیں، نہ ہر اِک شے کو دیکھ پاتے ہیں
بہ قدرِ فرصتِ نظّارگی، پئے تسکیں
اُچٹتی نظروں سے ہر شے کو دیکھ لیتے ہیں
اگر دوکاں کے جھروکے میں تم نہیں ہوتے
مَیں اجنبی کی طرح دیکھتا گزر جاتا
تم اتنا پیار نہ دیتے تو زندگی میری

بڑے سکون سے شاید گزر گئی ہوتی
اگر یہ پیار نہ ہوتا تو غمِ جدائی کا
مَیں سہہ بھی لیتا، تمہیں بھول بھی گیا ہوتا
یہ کیا غضب کیا تم نے، مَیں تم سے کیسے کہوں
عجیب عالمِ وارفتگی ہے تنہائی
کہ آدمی ہوں، مگر آدمی سے ڈرتا ہوں
خدا بنا کے مجھے بھول بھی گئے ہوتے
نہ مجھ کو یاد ہی کرتے، نہ مجھ کو یاد آتے

۱۴ر مارچ ۱۹۷۴ء

واہمہ

کان بجتے ہیں مرے فون کی گھنٹی کی طرح

مَیں سمجھتا ہُوں کہ تم نے مجھے پھر یاد کیا

خواب سے چونک کے اُٹھتا ہُوں کہ برقی رَو ہے

جو مرے جسم میں اِک جھُرجھُری دَوڑاتی ہے

دَوڑ کر فون کے آلے کو اُٹھا لیتا ہُوں

کوئی آواز نہیں صرف وہی کھَر کھَر ہے

گورکن جیسے کسی قبر میں مٹّی کھینچے

وقت کی قبر میں تم دفن ہو خوشیوں کی طرح

۲۴ مارچ ۱۹۷۴ء

○

دیکھا ہے انھیں اور نہ کوئی بات ہوئی ہے
ایسے بھی کبھی اُن سے ملاقات ہوئی ہے

جس چہرے کو دیکھوں مرا آئینہ ہے جیسے
تقسیم ہزاروں میں مری ذات ہوئی ہے

لمحات کی ممنونِ عنایت تو تھی دُنیا
اب زیست بھی پابندیِ اوقات ہوئی ہے

ہر شخصیتِ خاص، بہ عنوانِ تحفّظ
مرہونِ سرافرازیِ کتبات ہوئی ہے

وہ رنگ، تصوّر میں بھی میرے جو نہیں تھا
اُس رنگ سے تبدیلیِ حالات ہوئی ہے

تنہائی کو پھر راہزنِ وقت نے لُوٹا
مَیں نے تو یہ سمجھا تھا فقط رات ہوئی ہے

خلوت میں وہی بارشِ سوغات تھی آذرؔ
محفل میں جو تجدیدِ عنایات ہوئی ہے

۳۰ر مارچ ۷۴ء۱۹

راز کی بات

یُوں مِلنا بھی کچھ مِلنا ہے، کوری صُراحی کا پانی
جیسے پیاسے کو مِل جائے، خوشبُو سُونگھے، پی نہ سکے

مِلو تو ایسے کُھل کر مِلنا جیسے شام سے رات مِلے
بات کرو تو ایسے کرنا جیسے حِجابوں کا پندار

تاریکی میں ٹُوٹ گیا ہو، راز بھی کوئی راز نہ ہو

○

اچھا، اب یہ سب رہنے دو، آؤ سُنا لیں دِل کی بات
مَیں نے کِتنے جسم چُھوئے ہیں، تم نے کِتنے پیار کیئے

۱۲ مئی ۱۹۷۴ء

اَنا

تمہیں شاید نہ ہو اِس کا یقیں، اب تک تمہارے بعد
بہت دیکھے ہیں مَیں نے چہرے لیکن ایک ہی چہرہ
کچھ ایسا مَیں نے پایا، جس پہ آنکھیں ٹھہر جاتی ہیں
جبیں اُس کی، کہ جیسے اِک جہاں کی فکر سمٹی ہے
وہ آنکھیں، جن میں دِن بھر کی تھکن سوتی رہی شب بھر
جو جاگی ہیں تو جیسے رات بھر یادوں میں گزری ہے
وہ لب، جیسے کبھی لب راز کہہ دینے کو کھلتے ہیں
وہ چہرہ دِل میں لاکھوں دُکھ چھپائے مُسکراتا ہے
مَیں اب بھی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہُوں

۲۲ مئی ۱۹۷۴ء

○

زخموں سے میرے اس لئے پونچھا گیئے لہو
کچھ دیر تو رہے کوئی موضوعِ گفتگو

اک ایک اینٹ گھر کی، تری یاد میں ہے غرق
جھلکے ہے آج بھی مرے دیوار و در سے تو

یہ حوصلے کی بات ہے، زندہ ہوں آج تک
ورنہ ہے آج کل کسے جینے کی آرزو

ترکِ تعلقات کے بعد اُن سے جب ملا
وہ مجھ سے دیر تک رہے مصروفِ گفتگو

یہ کیا غضب ہے ایک زمانہ گزر گیا
پیاسا ہوں اور کوری صُراحی سے لگے ہے تُو

کچھ اتنا بے نیاز تبسّم لبوں پہ ہے
طرزِ تپاک ہے نہ یہ تحریکِ آرزُو

چہروں کے میلے دیکھتا پھرتا ہوں شہر شہر
دِل سے لگائے آج بھی اِک تیری جُستجُو

مَر مِٹ گیا تو کونسی دُنیا بدل گئی
زندہ رہا تو کب ہوئی تکمیلِ آرزُو

آذر تراشتے تو ہو خُونِ جگر سے تم
لیکن جبینِ بُت سے ٹپکتا نہیں لُہو

۲۷ر مئی ۱۹۷۴ء

خُدا

وہ، جس کو کام نہ پڑنے پہ یاد بھی نہ کرو
وہی، کہ جس کو نہ ثابت ہی کر سکا کوئی
وہ اِک خیال، کہ مُبہم بھی نارسا بھی ہے
مَیں اُس کی قید سے آزاد ہو گیا، لیکن
مجھے یہ ڈر ہے کہ پھر اک نئی نہ ہو کوئی قید
تمہاری یاد مِرا آسرا نہ بَن جائے
مِرا وجود بِکھر کر خُدا نہ بَن جائے

یکم جون ۱۹۷۴ء

وابستگی

بس ایک حادثہ ایسا گزر گیا دِل پر

کہ یاد آئے تو میرے ہر اک بُنِ مُو سے

تمام رات صدا سِسکیوں کی آتی ہے

بدل گئے ہیں خد و خال میری دُنیا کے

جُھلس گئی ہیں بہاریں مِری جوانی کی

نظر نظر سے ٹپکتا ہے زندگی کا لہُو

بچھڑ کے تجھ سے کسی مصلحت کی خاطر بھی

کسی سے مَیں نے ابھی تک کیا نہ سمجھوتہ

کہ جیسے سونپ چکا تجھ کو زندگی اپنی

○

ابھی جھجکتا ہوں اظہارِ آرزو کرتے

ابھی وہی ہے تری یاد کا کنوارا پن

۵ رجون ۷۴ ۱۹ء

تُہمت

صُبح چُبھتی ہے مری آنکھ میں ریزوں کی طرح

دوپہر جلتی ہے روئی ہوئی آنکھوں کی طرح

شام رگ رگ میں بھڑکتی ہے شراروں کی طرح

رات آنکھوں سے ٹپک جاتی ہے اشکوں کی طرح

چند گزُرے ہوئے لمحوں کے لئے جیتا ہُوں

چند یادوں سے مری زندگی وابستہ ہے

اور بہ ایں وصف یہ تُہمت ہے فراموشی کی

لوگ کہتے ہیں کہ مَیں بھُول گیا ہوں تم کو

۱۱ر جون ۱۹۷۴ء

دو دَور

کیا زمانہ تھا کہ اِک پَل کی جُدائی تیری
اِس قدر شاق گزُرتی تھی تڑپ جاتا تھا
تیرے پہلُو میں ہراِک رات وہ پہلی شب تھی
جس نے دو رُوحوں کو دو جسموں سے پہچانا تھا
ساتھ چھُوٹا تو تری یاد نے اک اِک پہلُو
اِس طرح بدلا کہ خلوت سے بھی گھبراتا ہُوں
تیری تصویر بھی دیکھوں تو لرز جاتا ہُوں

۲۲ جون ۱۹۷۴ء

○

سایہ ہُوں ترا مجھ کو نہ اپنے سے جُدا کر
ہے دُھوپ بہت اپنے ہی سائے میں چھپا کر

قرآنِ محبت ہُوں ذرا پڑھ کے مجھے دیکھ
ایماں ہُوں ترا رکھ مجھے سینے سے لگا کر

حیرت زدہ ہونٹوں میں زباں جس طرح آ جائے
تُو آ کے مجھے اِس طرح اَوروں سے جُدا کر

یہ دَور قیامت ہے، قیامت میں بھی مَیں نے
رکھا ہے ترے چہرے کو آنکھوں میں بسا کر

ہر سانس کی خوشبو سے ہر اک لفظ کو جانا
جو بات بھی کی اُس نے تو پھولوں میں بسا کر

جذبات کے افلاس میں ہر یاد کو بیچا
بس ایک تری یاد کو رکھا ہے بچا کر

خلوت میں خیالات کی اک بھیڑ لگی ہے
دیکھا نہ کبھی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر

محفل میں تو مَیں دھوم مچاتا ہوں مگر تم
دیکھو مرا کیا حال ہے تنہائی میں آ کر

جانے کبھی پھر تجھ سا صنم مل بھی سکے گا
رکھ لوں تجھے بُت خانۂ آذر میں سجا کر

۲۹ر جولائی ۱۹۷۴ء

جب ذکرِ محبّت کے تقدّس کا چھڑا ہے
مَیں نے تجھے نزدیک ہی محسوس کیا ہے

مَیں ٹُوٹے ہُوئے پیار کے جس کرب سے گزُرا
تنہائی کا وہ کرب تو رِسینے کا خَلا ہے

جس ایک اَدا کے لئے زندہ ہُوں ابھی تک
وہ ایک ترے لَوٹ کے آنے کی اَدا ہے

مَیں خواب میں جب تجھ کو کبھی دیکھ کے چونکا
جیتے ہوئے مرنے کا بھی احساس ہُوا ہے

ہر آن تری یاد میں اِس طرح تڑپنا
جینا نہیں، دراصل یہ جینے کی سزا ہے

ہر راہ میں قدموں کے نشاں ڈھونڈنے والو
منزل سے بھی آگے مرا نقشِ کفِ پا ہے

باقی نہ رہا کوئی نشاں یاد کا آذرؔ
محرابِ حوادث میں بس اِک نقشِ وفا ہے

۹ اگست ۱۹۷۴ء

جھجک رہے تھے اِدھر ہم تو وعدہ کرتے ہوئے
ذرا خیال نہ آیا اُنھیں مُکرتے ہوئے

چلے تھے سوچ کے شاید اُفق کو چھُو لیں گے
دھنک کے رنگ مِلے ٹُوٹتے بِکھرتے ہوئے

جو لمحے دولتِ یک عُمر رائیگاں سے تھے کبھی
وہ اپنے ساتھ خوشی لے گئے بِسرتے ہوئے

یہ چند گھڑیوں کی باتیں نہیں کہ عُمر لگی
ہمیں شکست کے بعد اِس طرح سنورتے ہوئے

تہہِ صلیب بھی جینا ہمیں عزیز رہا
یہ لوگ مرتے رہے زندگی بھی کرتے ہوئے

یہ فیضِ جام تھا یا فیضِ التفاتِ نظر
وہ اجنبی نہ لگا پاس سے گزرتے ہوئے

اُنھیں یہ ضد کہ میں زخموں کا اشتہار بھی دوں
مجھے تو شرم سی آتی ہے آہ بھرتے ہوئے

یہ بات کیا تھی کہ آذر فسانہ دِل میں
لرز رہے تھے حقیقت کا رنگ بھرتے ہوئے

۱۲ر اگست ۱۹۷۲ء

ہُوک

ہُو کا عالم ، ٹُوٹتے لمحوں کا کربِ بے اماں
کم سے کم اپنی اَنا کے واسطے ھم چیختے
اور سنّاٹے کی قبروں سے نِکلتے تاکہ لوگ
دیکھ لیں ہم کو تو جانیں آج بھی ھم زندہ ھیں
اور کچھ ایسے کہ اپنے آپ سے شرمندہ ھیں

۳۰ر اگست ۱۹۷۴ء

سنّاٹا

رات انگاروں پہ لوٹے ہے تو دِن آوارہ ہے

زندگی خود شور سے گھبرا گئی ہے اِس قدر

سانس سنّاٹے کی رُکتی ہے کہ آہٹ بھی نہیں

درد کی چوکھٹ پہ دُنیا سر جھکائے غم سے چُور

بے سروساماں یتیموں کی طرح رُسوا ہے آج

دِل میں احساسِ جمال اور پیار کی انگڑائیاں

ٹوٹتے نشّے کی مانند ایک بے نام انفعال
مُسکراہٹ کا گلا گھٹتا ہے، جینا ہے محال
ہر تمنّا جستجو کی آرزو میں مر گئی

جیسا چہرہ چاہیئے رل جائے گا بازار میں
خوشنما، گمبھیر، ہنستا، کرب میں ڈوبا ہُوا
ہم وہ ہیں جن کا کنوارا پن سلامت بھی نہیں
مطمئن ایسے کہ احساسِ ندامت بھی نہیں

۲۸ اگست ۱۹۷۴ء

○

بس اِک یہی تو حقیقت کا رُخ اَٹل نکلا
وہ وقت جا کے جو آتا نہیں وہ کل نکلا

مَیں جس کو جاں سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں
دفینہ وقت کا کھودا تو ایک پَل نکلا

کبھی نہ ختم ہوئی آرزوئے منزلِ شوق
ڈھلی جو دُھوپ تو سائے کے پیچھے چل نکلا

چلی تھی موجِ ہوا کس قدر غُرور کے ساتھ
جو تیری زُلف سے ٹکرا گئی تو بَل نکلا

وہ ایک غم کہ جسے ہم عذاب سمجھے تھے
وہ ایک غم ہی ترے پیار کا بدل نکلا

ہمیں یہ ڈر تھا کہ ٹوٹیں نہ پیار کے رشتے
سو، تیرا روٹھنا سب مشکلوں کا حل نکلا

ذرا خبر نہ ہوئی کب ہوا وہ بیگانہ
اس احتیاط سے وہ پاس سے سنبھل نکلا

سپردگی بھی بلا کی ہے بے خودی بھی ہے
جنوں کے سانچے میں جیسے وہ حسن ڈھل نکلا

ہر ایک زاویہ اس کے بدن کا دیکھ آذر
کہ والہانہ کوئی مطلعِ غزل نکلا

۳۰ر جولائی ۱۹۷۴ء

ترے بدن کی خنک آنچ گر زیادہ لگے
ہوا کا جھونکا بھی جیسے حریفِ بادہ لگے

میں ہو گیا ہوں کچھ اس طرح تجھ سے وابستہ
مرا خیال بھی اب تو ترا ارادہ لگے

تمام رات کٹی کروٹیں بدلتے ہوئے
ذرا سی نیند بھی بیمار کو زیادہ لگے

قبائے دیدگی چاہے وفورِ شوق تو کیا
کہ ضبطِ شوق تمنّاؤں پر لبادہ لگے

ہر ایک راہ ترے نقشِ پا سے روشن ہے
مَیں جس طرف بھی چلا جاؤں تیرا جادہ لگے

حصارِ ذات کی محدود وسعتوں سے ذرا
نکل کے دیکھو تو دُنیا بڑی کُشادہ لگے

ہر ایک شعر کا مضموں نیا سہی، لیکن
اساتذہ کا بھلا ہو کہ استفادہ لگے

زفرق تا بہ قدم بانکپن ہے آذر میں
فقیر ہی سہی صُورت سے شاہزادہ لگے

۷ ستمبر ۷۴ ۱۹ء

زخم زخم زندگی

سکوت، اِک عجب سکوت شہر پر محیط ہے
جمود، اس قدر جمود، جیسے ایک پاؤں پر
کھڑے ہوئے ہوں مرد و زن، طنابِ وقت کھنچ گئی
کوئی نہ ہل سکا کہ جیسے وقت خود ٹھہر گیا
گھڑی کی سوئیاں بھی جیسے رک گئی ہوں یک بیک
کہ ایک لمحۂ سکوت کو دوام مل گیا
ہر ایک شئے کو جیسے کوئی دم قیام مل گیا

رگوں میں خُون جَم گیا، قدم ٹھٹک کے رہ گئے
کہ اب تو دل میں حوصلہ بھی جہد کا نہیں رہا
نہ شوقِ کشمکش ہے وہ نہ دَرد کی وہ ٹیس ہے
نہ ذوقِ آرزُو ہے وہ نہ ہمّتِ شکست ہے
ہم ایک ٹھیس کے لئے رُکے ہوئے ہیں جو کبھی
جمُود ریزہ ریزہ کر کے زخم زخم زندگی
ہتھیلیوں کے طشت پر سجا کے ہم کو بھینٹ دے
ہم اُس صدا کے منتظر ہیں جو سکوت توڑ دے
جو ایک لمحے کے لئے دِلوں سے خُوں نچوڑ دے

۱۰ر ستمبر ۱۹۷۴ء

ابرِ سیہ کی کور

ہے آرزو کہ درد کی بے اعتدالیاں
کچھ اس قدر بڑھیں کہ کلیجہ نکل پڑے
کیا فائدہ کہ صرف اک ابرو پہ بل پڑے

دن رات کی کشاکشِ پیہم سے چھوٹتے
ذرّوں کی اس کشش سے نکلتے تو دیکھتے
یہ روز و شب کی کش مکشِ بے پناہ بھی
کچھ کم ستم نہیں ہے تو کچھ کم کرم نہیں

ابرِ سیہ کی کوروں سے چھنتی ہے روشنی

گوشے میں ہم خلا کے کہیں چھپ کے بیٹھتے

اور سوچتے کہ اِس کرۂ ارض پر جہاں

کوڑے کے تنکے بھوک بجھانے کے واسطے

بچّوں کا چُنتے چُنتے جھگڑنا تمام دن

ماؤں کی اِس حیات سے تنگ آ کے خودکُشی

یہ فکرِ روزگار کی پیہم شکایتیں

ہیں اِک عذابِ جہد کا ہیں تازیانہ بھی

آوازِ حق اُٹھانے کا ہیں اِک بہانہ بھی

۱۷ ستمبر ۱۹۷۴ء

حسابِ روز و شب

ہمارے دِن کے سمجھوتوں کا کفّارہ

ہماری شب کی نیندوں میں مُخل دِن بھر کے پچھتاوے

ہمارا صُبح دَم بستر سے اُٹھنا اِس طرح جیسے

حسابِ روز و شب کے اِک وَرَق سے

مَسخ ہوتی روشنائی

زندگی کے باب کی سُرخی ہٹاتی ہے

سحر کو ہم پُرانا ہر وَرَق

یوں خود جلاتے ہیں

کہ جیسے ہر گذشتہ کل ہے ایسا بوجھ

جس کو ڈھو نہیں سکتے

کتابِ زندگی اوراق سے خالی

فقط اِک کِرم خوردہ جِلد جیسی ہے

کم از کم اِک وَرَق ہوتا

کہ جس پر اپنے مستقبل کی سُرخی

"انقلابِ وقت" لکھ سکتے

۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۴ء

سلام خوشنویس

نام : میرزا راشد علیخاں

تخلّص : آذرؔ

پیدائش : ۳۱ر اگست ۱۹۳۱ء

تعلیم : بی۔اے، ایل ایل بی

بی۔ایڈ (عثمانیہ)

پہلا مجموعہ : نقشِ آذر ۔ ۱۹۶۳ء

دوسرا مجموعہ : صدائے تیشہ ۔ ۱۹۷۱ء